ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY



AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2626

Program: M.A. Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ فکر اسلامی، تاریخ وثقافت)

کوڈ: اسلامی اخلاق وتصوف (2626)

سطح: ایم اے علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ نمبر 1 تا 5)

کل نمبر: 100 — کامیابی کے نمبر: 40

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ حل شدہ گائیڈ صرف مطالعہ اور رہنمائی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ وہ نصابی کتاب کے متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کر کے مفاہیم کو اچھی طرح سمجھیں اور امتحانی مشق اپنے الفاظ اور اپنے اندازِ تحریر میں لکھیں، کیونکہ ہو بہو نقل کی گئی مشق یونیورسٹی کے قواعد کے مطابق قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ اس گائیڈ میں علمی معلومات عمومی مستند مآخذ کی روشنی میں اپنے الفاظ میں پیش کی گئی ہیں؛ قرآنی آیات واحادیث کے حوالے مفہوم کی وضاحت کے لیے عمومی معروف حوالوں کی صورت میں دیے گئے ہیں، لفظ بہ لفظ اقتباس کے بجائے ان کا مفہوم بیان کیا گیا ہے، اس لیے تحریر سے پہلے نصابی کتاب اور مستند ترجمے سے تصدیق ضرور کریں۔ کسی دینی حکم کا کسی مخصوص فرد، معاملے یا واقعے پر اطلاق اہلِ علم اور باقاعدہ دائرہ اختیار کا کام ہے؛ یہ گائیڈ صرف تعلیمی و مطالعاتی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

طریقۂ استعمال: ہر جواب تعارف، ذیلی عنوانات، جامع متن اور اختتام پر مشتمل ہے۔ جہاں وضاحت کے لیے مناسب ہوا وہاں جدول اور شکل بھی دی گئی ہے۔ خاکوں میں دکھائی گئی قدریں تدریسی وضاحت کے لیے مثالی (illustrative) ہیں، احصائیاتی دعویٰ نہیں۔ تحریر کرتے وقت اپنے الفاظ استعمال کریں۔

کورس کا تعارف اور اس مشق کا جائزہ

کورس "اسلامی اخلاق و تصوف" (2626) ایم اے علوم اسلامیہ کے طلبہ کو اسلامی اخلاقیات کے نظری و عملی نظام اور تصوف کی علمی و تربیتی روایت سے متعارف کراتا ہے۔ امتحانی مشق نمبر 1 یونٹ نمبر 1 تا 5 پر مشتمل ہے جن میں اخلاق کے فلسفیانہ مباحث اور قرآن و سنت کی اخلاقی تعلیمات زیرِ بحث آتی ہیں۔ اس مشق کے پانچوں سوالات اسی دائرے سے ہیں: ابن مسکویہ کا نظریۂ اخلاق، تعمیرِ اخلاق میں اسوۂ نبوی کا مقام، سنت کا قرآنی و نبوی مفہوم، امانت کا اسلامی فلسفہ اور سود کی حرمت و نقصانات۔ ہر سوال کے 20 نمبر ہیں، کل نمبر 100 اور کامیابی کے نمبر 40 ہیں، جیسا کہ چھپی ہوئی مشق میں درج ہے۔ اس گائیڈ میں ہر سوال کا جواب تعارف، ذیلی عنوانات، جامع بحث اور اختتام کے ساتھ اپنے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے؛ طلبہ نصابی کتاب کے یونٹس کا مطالعہ کر کے اپنے انداز میں تحریر کریں۔

سوال نمبر 1 (20 نمبر)

سوال: مسلم مفکر اخلاق ابن مسکویہ کا نظریہ اخلاق لکھیں۔ (20)

تعارف

ابن مسکویہ (وفات 421ھ / 1030ء) مسلم فکر کی تاریخ کے ان چند مفکرین میں سے ہیں جنہوں نے اخلاق کو ایک باقاعدہ، منظم اور مستقل علم کی صورت دی۔ ان کا پورا نام ابو علی احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ ہے۔ وہ ہمدان اور اصفہان کے علمی ماحول میں پروان چڑھے، آل بویہ کے دربار سے وابستہ رہے، تاریخ کی مشہور کتاب "تجارب الامم" بھی لکھی، مگر ان کی اصل شہرت ان کی اخلاقی تصنیف "تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق" سے ہے جسے مسلم اخلاقیات کی پہلی جامع اور فلسفیانہ کتاب قرار دیا جاتا ہے۔ ابن مسکویہ سے پہلے اخلاقی مباحث حدیث، زہد، ادب اور کلام کی کتابوں میں منتشر تھے؛ انہوں نے انہیں نفس کی حقیقت، فضائل و رذائل کی تقسیم اور تربیت کے اصولوں کے ساتھ ایک مربوط نظریے کی صورت میں پیش کیا۔ ان کے نظریے کی اہمیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے یونانی فلسفے خصوصاً افلاطون و ارسطو کے اخلاقی خیالات کو اسلامی فکر کے

مزاج کے مطابق ڈھال کر پیش کیا، اس لیے ان کے ہاں فلسفیانہ گہرائی اور دینی اخلاقیات کی عملی روح دونوں جمع نظر آتی ہیں۔ اس جواب میں ان کے اخلاقی نظریے کے بنیادی ستون یعنی نفس کا نظریہ، سعادت کا تصور، چار بنیادی فضائل، اعتدال کا اصول، عدل کی مرکزی حیثیت اور تربیتِ اخلاق کا طریقہ ترتیب سے بیان کیا جائے گا۔

ابن مسکویہ کا مختصر تعارف اور ”تہذیب الاخلاق“

ابن مسکویہ چوتھی صدی ہجری کے اواخر اور پانچویں صدی ہجری کے اوائل کے مفکر ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب بغداد و ری و اصفہان میں فلسفہ، طب، تاریخ اور ادب کی مجلسیں عام تھیں اور ترجمے کی تحریک کے نتیجے میں یونانی علمی ورثہ عربی میں منتقل ہو چکا تھا۔ ابن مسکویہ نے اس ورثے کا گہرا مطالعہ کیا اور ساتھ ہی اسلامی روایت سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ ”تہذیب الاخلاق“ سات مقالات (ابواب) پر مشتمل ہے جن میں نفس کی ماہیت، اخلاق کی تعریف و انواع، فضائل کی تقسیم، سعادت، عدل و محبت، اخلاقی بیماریوں یعنی رذائل کا علاج اور بچوں کی تربیت جیسے موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں۔ کتاب کا انداز دلیل اور تقسیم پر مبنی ہے: مصنف پہلے مفہوم کی تعریف کرتا ہے، پھر اس کی قسمیں گنواتا ہے، پھر ہر قسم کے آثار و علاج بیان کرتا ہے۔ یہی منظم اسلوب بعد کے اخلاقی مصنفین خصوصاً امام غزالی اور نصیر الدین طوسی کے لیے نمونہ بنا؛ طوسی کی ”اخلاقِ ناصری“ پر ابن مسکویہ کے اثرات نمایاں طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ طالب علم کو یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ابن مسکویہ کے ہاں اخلاق محض وعظ و نصیحت کا نام نہیں بلکہ نفس کی اصلاح کا ایک علم ہے جس کے اصول بھی ہیں، درجے بھی اور علاج بھی۔

نظریۂ نفس: اخلاق کی بنیاد

ابن مسکویہ کے اخلاقی نظام کی بنیاد ان کا نظریۂ نفس ہے۔ ان کے نزدیک انسان جسم و روح کا مرکب ہے، اور نفس (روح) ایک غیر مادی جوہر ہے جو جسم کی موت سے فنا نہیں ہوتا۔ اخلاق دراصل اسی نفس کی کیفیات و عادات کا نام ہے۔ مشہور تعریف جو اس روایت میں بیان ہوتی ہے یہ ہے کہ اخلاق نفس کی وہ کیفیت ہے جو انسان کو بغیر سوچے سمجھے اور تردد کے افعال کی طرف مائل کرتی ہے۔ اگر یہ کیفیت اچھی ہو تو اس سے اچھے افعال صادر ہوتے ہیں اور اسے فضیلت یا حسنِ خلق کہتے ہیں، اور اگر بری ہو تو برے افعال صادر ہوتے ہیں اور اسے رذیلت کہتے ہیں۔ ابن مسکویہ نفس کی تین بڑی قوتوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی تقسیم افلاطونی روایت سے ماخوذ ہے: قوتِ ناطقہ یا عاقلہ جس کا کام سوچنا،

سمجھنا اور حقائق کو جاننا ہے؛ قوتِ غضبیہ جس کا کام دفاع، غیرت اور مقابلہ ہے؛ اور قوتِ شہویہ جس کا کام خواہشات، لذت اور بقا کی جبلتوں کی تکمیل ہے۔ اخلاقی زندگی کا حسن اسی میں ہے کہ یہ تینوں قوتیں عقل کی رہنمائی میں اعتدال پر رہیں؛ جب کوئی قوت حد سے بڑھ جائے یا کم رہ جائے تو اخلاقی بیماری پیدا ہوتی ہے۔

سعادت (خوش بختی) کا تصور

ابن مسکویہ کے نزدیک اخلاق کا آخری مقصد سعادت یعنی حقیقی اور پائیدار خوش بختی و کمال کا حصول ہے۔ وہ سعادت کو محض مال و جاہ یا جسمانی لذت سے الگ کرتے ہیں، کیونکہ یہ چیزیں عارضی ہیں، دوسروں کے محتاج ہیں اور اکثر انسان کو اضطراب میں مبتلا رکھتی ہیں۔ حقیقی سعادت نفس کے کمال سے حاصل ہوتی ہے اور اس کے درجے ہیں: اول درجہ اپنی ذات کی اصلاح اور فضائل کا حصول، اور اعلیٰ درجہ یہ کہ انسان دوسروں کی بھلائی کا ذریعہ بھی بنے۔ چونکہ انسان فطرتاً مدنی و سماجی ہے، اس لیے اس کی سعادت تنہائی میں مکمل نہیں ہوتی بلکہ معاشرے کے اندر رہ کر، دوسروں کے حقوق ادا کر کے اور اجتماعی زندگی میں عدل قائم کر کے مکمل ہوتی ہے۔ اس نکتے سے ابن مسکویہ کا اخلاقی نظریہ خالص انفرادی زہد سے الگ ہو جاتا ہے: ان کے ہاں نیکی صرف ذاتی پاکیزگی نہیں بلکہ سماجی ذمہ داری بھی ہے۔ وہ سعادت کو دینی و دنیوی دونوں پہلوؤں سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جسمانی صحت، معاشی آسودگی اور اچھی صحبت بھی سعادت کی معاون شرائط ہیں، اگرچہ اس کا جوہر نفس کا کمال ہی ہے۔ نیک صحبت کی اہمیت پر ان کی تاکید خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، کیونکہ انسان اپنے ساتھیوں کے اخلاق سے لاشعوری طور پر متاثر ہوتا ہے اور بری صحبت بہترین تربیت کو بھی ضائع کر سکتی ہے۔

چار بنیادی فضائل اور اعتدال کا اصول

ابن مسکویہ کے نظام کی سب سے مشہور تعلیم چار بنیادی فضائل ہیں جو تین قوتوں کے اعتدال سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے تحت تمام جزئی فضائل آ جاتے ہیں۔ پہلی فضیلت حکمت ہے جو قوتِ عاقلہ کے اعتدال سے پیدا ہوتی ہے؛ ذکاوت، یادداشت، سرعتِ فہم اور صفائے ذہن اس کی شاخیں ہیں۔ دوسری فضیلت شجاعت ہے جو قوتِ غضبیہ کے اعتدال سے پیدا ہوتی ہے؛ حلم، بردباری، ثابت قدمی اور بڑے کاموں کا حوصلہ اس کے ماتحت ہیں۔ تیسری فضیلت عفت ہے جو قوتِ شہویہ کے اعتدال سے پیدا ہوتی ہے؛ حیاء، قناعت، ضبطِ نفس اور سخاوت اس کی شاخوں میں شمار ہوتے ہیں۔ چوتھی فضیلت عدالت ہے جو تینوں قوتوں کے باہمی توازن اور پورے نفس کی ہم آہنگی سے جنم لیتی ہے،

اس لیے اسے فضائل کی جامع اور سب سے کامل صورت کہا جاتا ہے۔ ہر فضیلت کے دونوں طرف افراط و تفریط کی صورت میں رذائل پیدا ہوتے ہیں: حکمت کی افراط مکر و چال بازی اور تفریط کند ذہنی و بے وقوفی، شجاعت کی افراط بے باکی و تہور اور تفریط بزدلی، عفت کی افراط حرص و لالچ اور تفریط جمود و خواہشات کی موت ہے۔ یوں اخلاق کا عملی اصول "اعتدال" بنتا ہے یعنی ہر قوت کو اس کی درست حد پر رکھنا۔ یہ اصول بعد کی پوری مسلم اخلاقی روایت کا مرکزی خیال بن گیا۔



شکل 1: ابن مسکویہ کے چار بنیادی فضائل — عدالت کو جامع فضیلت قرار دیا گیا ہے (تدریسی خاکہ، قدریں مثالی ہیں)

جدول 1: ابن مسکویہ کے ہاں قوائے نفس، فضائل اور افراط و تفریط کے رذائل

قوتِ نفس	اعتدال = فضیلت	افراط = رذیلت	تفریط = رذیلت
قوتِ عاقلہ	حکمت	مکر، فریب، چال بازی	کند ذہنی، بے وقوفی
قوتِ غضبیہ	شجاعت	بے باکی، تہور	بزدلی
قوتِ شہویہ	عفت	حرص، لالچ، بدکاری	جمود، خواہش کی موت
تینوں کا توازن	عدالت	ظلم و زیادتی	مظلومیت قبول کرنا، حق سے دست

برداری			

عدالت اور محبت: معاشرتی اخلاق

ابن مسکویہ کے ہاں عدالت صرف ایک شخصی فضیلت نہیں بلکہ پورے معاشرتی نظام کی بنیاد ہے۔ شہر و ریاست کا قیام، قوانین کی پابندی، حقوق کی ادائیگی اور لین دین کا درست چلنا سب عدل ہی سے ممکن ہے۔ وہ قانون کی پابندی کو عدل کی عملی صورت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حاکم کے لیے عدل سب سے پہلی شرط ہے، کیونکہ ایک فرد کا ظلم محدود ہوتا ہے مگر حاکم کا ظلم پوری رعایا کو متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح وہ محبت و الفت کو معاشرتی ربط کا اعلیٰ اصول بتاتے ہیں۔ ان کی رائے میں محبت عدل سے بھی بلند درجہ رکھتی ہے، کیونکہ عدل کی ضرورت وہاں پڑتی ہے جہاں اختلاف و تنازع ہو، جبکہ جہاں محبت ہو وہاں لوگ بغیر قانون کے بھی ایک دوسرے کا حق ادا کرتے ہیں اور ایثار سے کام لیتے ہیں۔ دوستی کے بارے میں ان کی بحث بھی مشہور ہے: وہ دوستی کو سعادت کی بڑی نعمت قرار دیتے ہیں اور سچے دوست کے انتخاب، اس کے حقوق اور اختلاف کی صورت میں انصاف و نرمی کی تلقین کرتے ہیں۔ ان خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اخلاق کتابی فلسفہ نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کا عملی ضابطہ تھا۔

تربیتِ اخلاق اور رذائل کا علاج

ابن مسکویہ کے نظریے کا عملی پہلو تربیت و علاج ہے۔ وہ اخلاق کو طبِ نفوس سے تشبیہ دیتے ہیں: جس طرح طبیب پہلے صحت کی تعریف، پھر بیماری کی اقسام، پھر ہر بیماری کا علاج بیان کرتا ہے، اسی طرح مربیِ اخلاق کو کرنا چاہیے۔ اخلاقی تبدیلی کے امکان پر وہ واضح موقف رکھتے ہیں کہ اخلاق بدل سکتا ہے؛ اگر اخلاق بدل نہ سکتا تو تربیت، وعظ، قانون اور سزا و جزا سب بے معنی ہو جاتے۔ تبدیلی کا طریقہ تدریجی مشق و عادت ہے: پہلے علم سے درست و غلط کی پہچان ہو، پھر ارادے سے عمل شروع ہو، پھر مشق سے وہ عمل عادت بن جائے اور آخر میں طبیعتِ ثانیہ کی صورت اختیار کر لے۔ بچوں کی تربیت پر ان کی بحث خاص طور پر مفصل ہے: وہ بچے میں سب سے پہلے حیاء کی صفت کو دیکھنے اور پروان چڑھانے کی تاکید کرتے ہیں، کیونکہ حیاء برائی سے روک کا فطری آغاز ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہر رذیلت کے علاج کے لیے اس کی ضد کی مشق تجویز کرتے ہیں: بخل کا

علاج سخاوت کی مشق سے، غصے کا علاج حلم و بردباری کی مشق سے، تکبر کا علاج تواضع کے کاموں سے؛ اور ساتھ ہی خود احتسابی، اچھی صحبت اور بری محفلوں سے اجتناب کو بنیادی ذرائع بتاتے ہیں۔ یہ علاجی و تربیتی اسلوب بعد میں امام غزالی کی "احیاء العلوم" کی مجاہدہ و ریاضت کی بحثوں کا پیش رو سمجھا جاتا ہے۔

ابن مسکویہ کے نظریے کی خصوصیات اور اثرات

مجموعی جائزہ لیا جائے تو ابن مسکویہ کے نظریے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں: اول، اخلاق کو مستقل علم کی حیثیت دینا اور اس کی تعریف، تقسیم اور اصول متعین کرنا۔ دوم، یونانی فلسفیانہ ورثے کو اسلامی مزاج کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کرنا، جس سے مسلم فکر کی وسعت ظاہر ہوتی ہے۔ سوم، اخلاق کو نفس کی سعادت و کمال سے جوڑنا اور اسے محض قانونی پابندی یا سماجی دباؤ سے الگ رکھنا۔ چہارم، فرد کی اصلاح کے ساتھ معاشرتی عدل، محبت اور باہمی تعاون پر زور دینا۔ پنجم، تربیت و علاج کا قابلِ عمل طریقہ پیش کرنا۔ ان کے اثرات مسلم اخلاقی ادب پر دیرپا رہے: "اخلاق ناصری" سے لے کر برصغیر کے مدارس میں پڑھائی جانے والی اخلاقی کتب تک اس تقسیم و اسلوب کی جھلک ملتی ہے۔ تنقیدی نظر سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاں فلسفیانہ رنگ غالب ہے اور وحی و سنت کے حوالے نسبتاً کم ہیں، تاہم یہ بات بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے نظام کو شریعت کے مخالف نہیں بلکہ اس کا معاون قرار دیا اور یہی توازن ان کی مقبولیت کی وجہ بنا۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ ابن مسکویہ کا نظریۂ اخلاق نفس کی قوتوں کے اعتدال، چار بنیادی فضائل یعنی حکمت، شجاعت، عفت اور عدالت، سعادت کے حصول اور تربیت و علاجِ نفوس پر قائم ایک منظم نظام ہے۔ انہوں نے اخلاق کو منتشر نصیحتوں سے نکال کر ایک علم بنا دیا جس میں انسان اپنی کمزوری کی تشخیص بھی کر سکتا ہے اور اس کا علاج بھی۔ آج کے طالب علم کے لیے ان کا سب سے بڑا سبق یہی ہے کہ اچھا اخلاق پیدائشی اتفاق نہیں بلکہ علم، ارادے اور مسلسل مشق سے بننے والی عادت ہے، اور اس کی کامل صورت وہ عدل و محبت ہے جو فرد سے شروع ہو کر پورے معاشرے کو سنوارتی ہے۔

سوال نمبر 2 (20 نمبر)

سوال: تعمیر اخلاق میں نبی کریم ﷺ کا اسوہ بیان کریں۔(20)

تعارف

اسلام میں اخلاق کی تعمیر کا سب سے مکمل اور عملی نمونہ نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہے۔ قرآن مجید نے آپ ﷺ کے اخلاق کو "خلقِ عظیم" قرار دیا اور آپ ﷺ کی ذات کو مومنوں کے لیے "اسوۂ حسنہ" یعنی بہترین نمونہ قرار دیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایمان والوں کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں اتباع کا معیار سیرتِ نبوی ہے۔ آپ ﷺ نے خود اپنی بعثت کا مقصد مکارمِ اخلاق کی تکمیل بیان فرمایا، جس سے واضح ہوتا ہے کہ اخلاق کی تعمیر نبوی مشن کا اضافی باب نہیں بلکہ اس کا مرکزی ہدف تھی۔ اخلاق کی کتابی تعلیم دنیا میں بہت سی قوموں کے پاس موجود تھی، مگر نبی کریم ﷺ کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جو سکھایا وہ پہلے خود کر کے دکھایا: سچائی، امانت، رحم، عدل، صبر، شکر، تواضع اور ایفائے عہد آپ ﷺ کی روزمرہ زندگی کی جھلک تھی، اسی لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے اخلاق کو قرآن کی عملی صورت یعنی چلتا پھرتا قرآن قرار دیا۔ اس جواب میں پہلے اسوۂ نبوی کا مفہوم واضح کیا جائے گا، پھر آپ ﷺ کی سیرت سے اخلاق کی تعمیر کے نمایاں پہلو، پھر اس تعمیر کے نبوی طریقے اور آخر میں معاصر زندگی کے لیے اس کی رہنمائی بیان کی جائے گی۔

اسوۂ حسنہ کا مفہوم اور اخلاق سے اس کا تعلق

اسوہ کے معنی ہیں نمونہ، مثال اور وہ نمونۂ عمل جس کی پیروی کی جائے۔ قرآن نے اسوۂ حسنہ کا ذکر سورۃ الاحزاب میں غزوۂ خندق کے مشکل حالات کے پس منظر میں کیا، جس سے سبق ملتا ہے کہ سیرت کی پیروی صرف آسان حالات میں نہیں بلکہ آزمائش، خوف اور قربانی کے لمحوں میں بھی مطلوب ہے۔ اسی طرح سورۃ الممتحنہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوے کا ذکر آیا ہے، مگر نبی کریم ﷺ کا اسوہ اس لحاظ سے جامع ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس سے باہر نہیں: عبادت و زہد ہو یا خاندانی زندگی، تجارت و معاملات ہوں یا حکمرانی و جنگ، دوستوں سے برتاؤ ہو یا دشمنوں سے معاملہ۔ اخلاق کی تعمیر کے لیے اسوے کی اہمیت اس لیے بنیادی ہے کہ انسان کتابی اصولوں سے زیادہ زندہ

مثال سے سیکھتا ہے۔ اصول بتاتا ہے کہ سچ بولنا چاہیے، مگر سیرت دکھاتی ہے کہ نقصان کے خطرے، دشمن کے دباؤ اور کمزور کی حمایت جیسے ہر امتحان میں سچ پر قائم کیسے رہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم اخلاقی روایت میں سیرت کو ہمیشہ اخلاق کی پہلی درس گاہ سمجھا گیا۔

سیرتِ نبوی سے اخلاق کے نمایاں پہلو

1۔ سچائی، امانت اور ایفائے عہد

نبوت سے پہلے ہی اہلِ مکہ آپ ﷺ کو "الصادق الامین" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ یہ لقب محض شہرت نہیں تھا بلکہ چالیس سالہ زندگی کا تجربہ تھا: تجارت میں دیانت، امانتوں کی حفاظت اور وعدے کی پابندی آپ ﷺ کی پہچان تھی۔ نبوت کے بعد بھی یہی روش قائم رہی۔ دشمنوں کی امانتیں آپ ﷺ کے پاس محفوظ رہیں اور ہجرت کی شب انہیں لوٹانے کا انتظام کر کے آپ ﷺ روانہ ہوئے۔ معاہدوں میں آپ ﷺ نے ہمیشہ ایفائے عہد کو ترجیح دی، خواہ ظاہر فائدہ خلافِ عہد کرنے میں نظر آتا ہو؛ صلح حدیبیہ کی شرائط پر عمل اس کی روشن مثال ہے جس میں اسلامی ریاست نے اپنے وعدے کی لاج رکھی۔ امانت دارانہ کے اس اخلاق نے معاشرے میں اعتماد پیدا کیا اور یہی اعتماد کسی بھی تجارتی و سماجی نظام کی بنیاد ہوتا ہے۔ آج کے طالب علم کے لیے اس اسوے کا پیغام یہ ہے کہ دیانت وقتی پالیسی نہیں بلکہ شخصیت کا مستقل وصف ہے جو امتحان کے لمحے میں پرکھا جاتا ہے۔

2۔ رحم، شفقت اور خدمتِ خلق

قرآن نے آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت قرار دیا، اور سیرت اس رحمت کی عملی تصویر ہے۔ بچوں سے شفقت، بوڑھوں کا احترام، بیمار کی عیادت، یتیم و مسکین کی خبر گیری اور پڑوسی کے حقوق کی تاکید آپ ﷺ کی تعلیم و عمل دونوں میں نمایاں ہے۔ آپ ﷺ نے کمزوروں کو معاشرے کا مرکز بنایا: غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک، خادم سے نرمی اور عورتوں کے حقوق کی حفاظت آپ ﷺ کی ہدایات و عمل سے ثابت ہے۔ رحم کا یہ اخلاق صرف جذبات کا نام نہیں تھا بلکہ اس کا اظہار عملی خدمت سے ہوتا تھا: بھوکے کو کھانا کھلانا، مقروض کو مہلت دینا اور مجبور کی سفارش قبول کرنا اسی کی صورتیں ہیں۔ دشمن کے ساتھ بھی آپ ﷺ کی رحمت نمایاں رہی؛ فتح مکہ کے دن عام معافی

کا اعلان انسانی تاریخ میں انتقام کے بجائے عفو کی عظیم مثال ہے۔ اخلاق کی تعمیر میں یہ اسوہ سکھاتا ہے کہ طاقت کا اصل کمال کمزور کی حفاظت ہے اور بڑائی کا اصل معیار خدمت ہے نہ کہ خدمت لینا۔

3۔ عدل، صبر اور تواضع

آپ ﷺ کا عدل رشتہ داری و دشمنی دونوں سے بالاتر تھا۔ چوری کے مقدمے میں ایک بااثر خاندان کی سفارش پر آپ ﷺ کا تاریخی ارشاد کہ اگر میری بیٹی بھی چوری کرتی تو اس پر بھی حد جاری ہوتی، قانون کی بالادستی اور مساوات کا وہ اصول ہے جس پر جدید ریاستیں بھی فخر کرتی ہیں۔ صبر کی زندگی طائف کے سفر سے لے کر ہجرت و غزوات تک ہر مرحلے میں نظر آتی ہے: ذاتی اذیت پر انتقام نہیں لیا، تکلیف پر شکوے کے بجائے دعا کی اور دعوت میں ثابت قدمی دکھائی۔ تواضع کا حال یہ تھا کہ مجلس میں عام آدمی کی طرح بیٹھتے، اپنے کام خود کرتے، مہمان کی خدمت کرتے اور سلام میں پہل فرماتے۔ ان تینوں صفات کا امتزاج اخلاق کی تعمیر کا توازن فراہم کرتا ہے: عدل معاشرے کو بچاتا ہے، صبر فرد کو آزمائش میں قائم رکھتا ہے اور تواضع کبر و خود پسندی جیسی جڑ کی بیماریوں کا علاج ہے۔ سیرت کا طالب علم دیکھتا ہے کہ آپ ﷺ کی ان صفات میں کوئی تصنع نہیں تھا؛ یہ اللہ کی بندگی اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے پیدا ہونے والا مستقل مزاج تھا۔

جدول 1: سیرتِ نبوی کے اخلاقی پہلو اور ان کی عملی صورتیں

تعمیرِ اخلاق کے لیے سبق	سیرت میں عملی صورت	اخلاقی وصف
دیانت شخصیت کی پہچان ہو، پالیسی نہیں	لقب الصادق الامین؛ امانتوں کی واپسی	سچائی و امانت
فائدے کے لیے وعدہ خلافی جائز نہیں	صلح حدیبیہ کی شرائط کی پابندی	ایفائے عہد
طاقت کا کمال معاف کرنا ہے	فتح مکہ پر عام معافی	رحم و عفو
قانون کی بالادستی معاشرے کی بنیاد ہے	سفارش سے انکار؛ قانون سب کے لیے برابر	عدل و مساوات

آزمائش میں ثابت قدمی، کامیابی میں عاجزی	طائف میں دعا؛ عام آدمی کی طرح زندگی	صبر و تواضع

تعمیرِ اخلاق کا نبوی طریقۂ کار

نبی کریم ﷺ نے اخلاق کی تعمیر کے لیے جو طریقہ اختیار فرمایا وہ آج کی تربیتی نفسیات کی نظر میں بھی بے حد حکیمانہ ہے۔ پہلا طریقہ خود نمونہ بننا تھا: آپ ﷺ نے کسی عمل کا حکم دینے سے پہلے اس پر خود عمل کیا، اس لیے صحابہ کے دلوں میں حکم کے ساتھ اس کی عملی شکل بھی موجود ہوتی تھی۔ دوسرا طریقہ تدریج تھا: شراب کی حرمت اور دیگر سماجی اصلاحات مراحل سے نافذ ہوئیں تاکہ طبیعتیں آمادہ ہوتی جائیں۔ تیسرا طریقہ ترغیب و ترہیب کا توازن تھا: نیکی پر جنت و رضائے الٰہی کی بشارت اور برائی پر آخرت کی جواب دہی کی تنبیہ، دونوں انسان کے اندرونی محرک کو جگاتے ہیں۔ چوتھا طریقہ موقع محل کے مطابق نصیحت تھا: سوالات کے جواب، واقعات پر تبصرے اور انفرادی رہنمائی کے ذریعے ہر شخص کی مزاجی ضرورت پوری ہوتی تھی۔ پانچواں طریقہ اچھی صحبت و ماحول کی تعمیر تھا: مسجد، اخوت اور مجلسِ نبوی نے نیکی کو سماجی فضا کا حصہ بنا دیا، جہاں نیک عمل معمول اور قابلِ تحسین تھا۔ چھٹا طریقہ خود احتسابی کی تربیت تھی: دن کے اعمال کا محاسبہ اور توبہ کی طرف رجوع انسان کو باہر کے نگران کے بجائے اپنے ضمیر کا نگران بناتا ہے۔ ان طریقوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوی تربیت میں علم، مثال، ماحول اور محاسبہ چاروں جمع تھے، اور یہی چار چیزیں آج بھی اخلاقی تعلیم کی کامیابی کی شرط ہیں۔

معاصر زندگی میں اسوۂ نبوی کی رہنمائی

آج جب مادیت، خود غرضی اور انتشار نے اخلاقی بحران پیدا کیا ہے، اسوۂ نبوی کی رہنمائی پہلے سے زیادہ اہم ہو گئی ہے۔ خاندانی زندگی میں نرمی، رحم اور باہمی حقوق کا نبوی درس طلاق و نزاع سے بھرے گھروں کے لیے علاج ہے۔ تجارت و ملازمت میں سچائی و امانت کا اصول کرپشن اور دھوکا دہی کے خلاف سب سے مضبوط جواب ہے، کیونکہ قانون کی گرفت سے بچ جانے والا بھی ضمیر کی گرفت سے نہیں بچ سکتا، اور سیرت اسی ضمیر کو بیدار کرتی ہے۔ سماجی زندگی میں پڑوسی، اقلیت اور کمزور طبقے کے ساتھ حسنِ سلوک کا نبوی نمونہ بدامنی اور تعصب کا توڑ ہے۔ ڈیجیٹل دور میں زبان کی حفاظت، کسی کی عیب جوئی سے اجتناب اور خبر کی تحقیق جیسے نبوی اصول سوشل میڈیا کے اخلاقی مسائل کا براہ راست حل پیش کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ سیرت کا مطالعہ محض معلومات کے لیے نہیں بلکہ محبت و اتباع کے لیے کرنا چاہیے: اہلِ علم کہتے ہیں کہ جس کے دل میں نمونے سے

محبت پیدا ہو جائے اس کے لیے اس کی پیروی آسان ہو جاتی ہے۔ اسی لیے سیرت کی مجالس، کتبِ سیرت کا مطالعہ اور سنتوں پر عمل کی چھوٹی چھوٹی عادتیں اخلاق کی تعمیر کا عملی آغاز ہیں۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ تعمیرِ اخلاق میں نبی کریم ﷺ کا اسوہ جامع، عملی اور قابلِ اتباع نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نے سچائی و امانت، رحم و خدمت، عدل و مساوات، صبر و تواضع کو پہلے اپنی زندگی میں ثابت کیا، پھر محبت، تدریج، ماحول اور محاسبے کے حکیمانہ طریقوں سے اُمت کے اخلاق کی تعمیر کی۔ دنیا کی کوئی اخلاقی تعلیم اس لیے مؤثر نہیں ہو سکتی کہ اس کے پیچھے زندہ مثال نہ ہو؛ سیرتِ نبوی اس خلا کو ہمیشہ کے لیے پُر کر دیتی ہے۔ لہٰذا طالب علم کے لیے درست طریقہ یہ ہے کہ وہ اخلاق کے اصول کتاب سے اور اس کی روح و صورت سیرت سے سیکھے، اور چھوٹی عادتوں سے آغاز کر کے اسوے کی روشنی میں اپنی شخصیت کی تعمیر کرتا رہے۔

سوال نمبر 3 (20 نمبر)

سوال: قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں استقامت کا مفہوم بیان کریں۔ (20)

تعارف

استقامت اسلامی اخلاق کے ان بنیادی اوصاف میں سے ہے جن کے بغیر ایمان کا دعویٰ اور نیکی کی کوشش دونوں ادھورے رہ جاتے ہیں۔ عام زندگی میں بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ کامیاب لوگ وہ نہیں ہوتے جو ایک دن بڑا جوش دکھائیں اور پھر چھوڑ دیں، بلکہ وہ ہوتے ہیں جو درست سمت میں مسلسل اور ثابت قدمی سے چلتے رہیں۔ دینی زندگی میں اسی کیفیت کا نام استقامت ہے۔ قرآن مجید نے استقامت پر بڑی خوشخبریاں بیان کی ہیں: ایک جگہ اہلِ ایمان کے اس قول کا ذکر ہے کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر ثابت قدم رہنے والوں کے لیے فرشتوں کے نزول اور خوف و حزن سے نجات کا وعدہ بیان ہوا ہے، اور نبی کریم ﷺ کو بھی کئی مواقع پر استقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک مشہور حدیث کا

مفہوم ہے کہ ایک صحابی نے مختصر اور جامع نصیحت کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کہو میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر استقامت اختیار کرو۔ اس ایک جملے میں ایمان اور استقامت کو پوری دینی زندگی کا خلاصہ قرار دیا گیا ہے۔ اس جواب میں استقامت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم، قرآن و سنت میں اس کی صورتیں اور فضیلت، اس کے عملی تقاضے، اس کی راہ کی رکاوٹیں اور اسے حاصل کرنے کے ذرائع بیان کیے جائیں گے۔

استقامت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

استقامت عربی کے لفظ "ق و م" سے ماخوذ ہے جس کے بنیادی معنی سیدھا کھڑا ہونا، راستہ پر جمنا اور قائم رہنا ہیں۔ استقامت کا لغوی مفہوم ہے سیدھا رہنا، راستے پر قائم رہنا، ٹیڑھ اور انحراف سے بچے رہنا۔ اصطلاح میں استقامت سے مراد یہ ہے کہ انسان ایمان و ایقان کے بعد شریعت کے سیدھے راستے یعنی صراطِ مستقیم پر ثابت قدمی کے ساتھ چلتا رہے؛ عقیدے میں شک و تذبذب سے پاک رہے، عبادت میں تسلسل رکھے، اخلاق میں اعتدال پر قائم رہے اور حالات کی تبدیلی، خواہشات کے دباؤ اور لوگوں کی مخالفت کے باوجود حق سے منحرف نہ ہو۔ اہلِ علم نے استقامت کی تعریف کئی انداز سے کی ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت پر مداومت، فرائض کی پابندی، محرمات سے اجتناب اور سیرت و کردار کی مسلسل درستگی استقامت ہے۔ بعض صوفیائے کرام نے استقامت کو کرامت سے بھی بلند قرار دیا ہے، کیونکہ کرامت وقتی کیفیت ہو سکتی ہے جبکہ استقامت پوری زندگی کا رخ متعین کرتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ سب سے بڑی کرامت استقامت ہے۔ یہ مفہوم اس بات کو بھی واضح کرتا ہے کہ استقامت وقتی جوش یا عارضی نیکی کا نام نہیں، بلکہ درست سمت، استمرار اور ثابت قدمی، ان تینوں کا مجموعہ ہے۔

قرآن مجید کی روشنی میں استقامت

قرآن مجید میں استقامت کا ذکر کئی مقامات پر آیا ہے اور ہر مقام پر اس کے ساتھ عظیم وعدے جڑے ہیں۔ سورۃ فصلت میں بیان ہوا کہ جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور انہیں دنیا و آخرت میں بشارت دیتے ہیں کہ خوف نہ کرو اور غم نہ کرو۔ اس آیت سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں: ایک یہ کہ اصل کمال دعوے میں نہیں بلکہ دعوے کے بعد قائم رہنے میں ہے؛ دوسری یہ کہ استقامت کا صلہ سب سے پہلے دل کا سکون ہے یعنی خوف و حزن سے آزادی۔ سورۃ ہود

میں نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ اسی طرح استقامت اختیار کریں جیسا آپ کو حکم دیا گیا ہے، اور آپ کے ساتھ توبہ کرنے والے بھی حد سے تجاوز نہ کریں۔ اس آیت کی شدت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے سورۃ ہود کا ذکر کرکے فرمایا کہ اس نے مجھے بوڑھا کر دیا، جس سے مفسرین نے استقامت کی ذمہ داری کی سنگینی مراد لی ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں بھی اسی طرح راہِ راست پر قائم رہنے اور خواہشات کی پیروی نہ کرنے کی ہدایت آئی ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ الاحقاف میں ایمان و استقامت والوں کے لیے جنت کا وعدہ اور ان کے خوف و حزن کی نفی کی گئی ہے۔ قرآنی مجموعی مطالعے سے استقامت کی تین جہتیں سامنے آتی ہیں: عقیدے کی استقامت یعنی توحید پر تزلزل کے بغیر قائم رہنا، عبادت و اطاعت کی استقامت یعنی فرائض و نیکیوں پر مداومت، اور اخلاق و معاملات کی استقامت یعنی ہر حال میں حق و انصاف پر جمے رہنا۔

سنت و سیرت کی روشنی میں استقامت

سنتِ نبوی میں استقامت کی تعلیم قول و عمل دونوں سے ملتی ہے۔ حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث میں آپ ﷺ نے ایمان کے بعد استقامت کو جامع نصیحت قرار دیا، اور جب انہوں نے کسی چیز سے زیادہ بچنے کی بات پوچھی تو آپ ﷺ نے اپنی زبان کی طرف اشارہ فرمایا، جس کا مفہوم ہے کہ استقامت کی راہ میں زبان کی بے احتیاطی سب سے بڑی رکاوٹوں میں سے ہے۔ نبی کریم ﷺ کی اپنی زندگی استقامت کی اعلیٰ ترین مثال ہے: مکہ کے تیرہ سال ظلم و ایذا، طائف کی تکلیف، ہجرت کے خطرات، غزوات کی آزمائشیں اور مدنی ریاست کی ذمہ داریاں، ہر مرحلے میں آپ ﷺ اپنے مقصد و اصول پر قائم رہے۔ نہ دھمکی آپ ﷺ کو جھکا سکی، نہ لالچ خرید سکا اور نہ ذاتی انتقام نے اصولوں سے ہٹایا۔ صحابہ کرام کی زندگیاں بھی اسی تربیت کا ثمرہ ہیں: حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذیت پر ثابت قدمی، حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی شہادت پر استقامت اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی قربانیاں اسی درس کے نمونے ہیں۔ سنت سے یہ اصول بھی ملتا ہے کہ پسندیدہ عمل وہی ہے جس پر مداومت ہو اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو؛ اس سے استقامت کا عملی پیمانہ واضح ہوتا ہے کہ بڑی مگر ٹوٹ جانے والی کوشش کے مقابلے میں چھوٹی مگر مسلسل کوشش بہتر ہے۔ عبادت میں میانہ روی کی نبوی ہدایت بھی اسی لیے ہے کہ افراط انسان کو تھکا کر پورے عمل سے بیزار کر دیتا ہے، جبکہ اعتدال و تسلسل اسے زندگی بھر قائم رکھتا ہے۔

جدول 1: استقامت کی اقسام، ان کا مطلب اور عملی مثال

قسم	مطلب	عملی مثال
عقیدے کی استقامت	توحید و ایمان پر شک و تذبذب کے بغیر قائم رہنا	فتنوں و وسوسوں کے دور میں بھی بنیادی عقائد پر یقینِ کامل
عبادت کی استقامت	فرائض و نوافل پر مداومت و تسلسل	نماز کی پابندی ہر حال میں قائم رکھنا
اخلاق کی استقامت	کردار و معاملات میں حق پر ثابت قدمی	نفع و نقصان کے باوجود سچ اور انصاف نہ چھوڑنا
مقصد کی استقامت	نیک مقصد میں رکاوٹوں کے باوجود آگے بڑھنا	تعلیم و خدمت کے کام میں مایوس ہو کر دست بردار نہ ہونا

استقامت کے عملی تقاضے اور رکاوٹیں

استقامت کے عملی تقاضوں میں سب سے پہلا تقاضا صراطِ مستقیم کی درست پہچان ہے، کیونکہ غلط سمت میں ثابت قدمی استقامت نہیں بلکہ ہٹ دھرمی کہلائے گی؛ اس لیے علم و رہنمائی کے بغیر استقامت کا تصور نامکمل ہے۔ دوسرا تقاضا مداومت ہے یعنی نیکی کو موسم و مزاج کا تابع نہ رکھا جائے۔ تیسرا تقاضا صبر ہے، کیونکہ استقامت کا راستہ اکثر مخالفت، تنہائی اور فوری نتائج کی کمی سے گزرتا ہے۔ چوتھا تقاضا خود احتسابی ہے تاکہ خاموش انحراف وقت پر پکڑا جا سکے۔ استقامت کی راہ میں بڑی رکاوٹیں تین ہیں: نفس کی خواہشات جو آسانی و لذت کی طرف کھینچتی ہیں، شیطان کے وسوسے و مایوسی کے حربے، اور ماحول و معاشرے کا دباؤ جو حق پر چلنے والے کو اجنبی بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ غفلت، سستی اور بری صحبت بھی آہستہ آہستہ رخ بدل دیتی ہیں، اسی لیے انحراف عموماً اچانک نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کے تسلسل سے آتا ہے۔ طالب علم کو یہ نکتہ سمجھنا چاہیے کہ استقامت کا دشمن اکثر بڑا گناہ نہیں بلکہ نیکی میں بے ترتیبی اور تسلسل کا ٹوٹنا ہوتا ہے۔

استقامت حاصل کرنے کے ذرائع

قرآن وسنت کی روشنی میں استقامت حاصل کرنے کے ذرائع بھی واضح ہیں۔ پہلا ذریعہ علم ویقین ہے: جب انسان کو اللہ کی معرفت اور آخرت کا یقین حاصل ہو تو وقتی دباؤ اسے ہلا نہیں سکتا۔ دوسرا ذریعہ دعا ہے؛ اہلِ ایمان کو دلوں کے [illegible] رہنے کی دعا سکھائی گئی ہے اور نبی کریم ﷺ خود "یامقلب القلوب" والی دعا کثرت سے کرتے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ استقامت انسان کی اپنی طاقت سے زیادہ اللہ کی توفیق کا نام ہے۔ تیسرا ذریعہ نیک صحبت ہے، کیونکہ استقامت والوں کی مجلس فرد کو بھی قائم رکھتی ہے اور تنہائی اکثر لغزش کی جڑ ہوتی ہے۔ چوتھا ذریعہ چھوٹے مگر مسلسل اعمال ہیں: روزانہ کا مقررہ عمل، چاہے مختصر ہو، مزاج میں پختگی پیدا کرتا ہے۔ پانچواں ذریعہ سیرت واہلِ استقامت کی زندگیوں کا مطالعہ ہے جو ہمت وحوصلہ دیتا ہے۔ چھٹا ذریعہ فوری توبہ ہے: لغزش ہو جائے تو مایوس ہو کر راستہ چھوڑنے کے بجائے فوراً پلٹنا ہی استقامت کی روح ہے، کیونکہ استقامت کا مطلب خطا سے مبرا ہونا نہیں بلکہ خطا کے بعد راستہ نہ چھوڑنا ہے۔ ان ذرائع کے اجتماع سے استقامت ایک مزاج بن جاتی ہے جو عمر کے ساتھ کمزور ہونے کے بجائے پختہ ہوتا جاتا ہے۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں استقامت کا مفہوم ایمان کے بعد صراطِ مستقیم پر علم، صبر اور مداومت کے ساتھ زندگی بھر قائم رہنا ہے۔ قرآن نے اس پر فرشتوں کی بشارت، خوف وحزن سے نجات اور جنت کے وعدے بیان کیے، سنت نے اسے جامع ترین نصیحت قرار دیا اور سیرتِ نبوی نے اس کی زندہ مثال پیش کی۔ استقامت کرامت سے بڑی ہے کیونکہ وہ وقتی کیفیت نہیں بلکہ پوری زندگی کا رخ ہے۔ آج کے فتنوں ومصروفیات کے دور میں اس کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے، اور اس کا عملی نسخہ وہی ہے: دعا، علم، نیک صحبت، مسلسل عمل اور فوری توبہ۔ جس نے یہ اپنا لیے، اس کے لیے حالات کی تبدیلی رخ کی تبدیلی نہیں بن سکتی۔

سوال نمبر 4 (20 نمبر)

سوال: امانت کا اسلامی فلسفہ بیان کریں۔ (20)

تعارف

امانت اسلامی اخلاق و معاشرت کے بنیادی ستونوں میں سے ایک ہے، اس قدر بنیادی کہ قرآن مجید نے مومنوں کی نمایاں صفات میں امانتوں اور عہد کی رعایت کو شامل کیا اور نبی کریم ﷺ نے خیانت کو منافقت کی علامت قرار دیا۔ اسلامی تصور میں امانت صرف کسی کی رکھی ہوئی رقم یا چیز واپس کرنے کا نام نہیں؛ یہ ایک وسیع فلسفہ ہے جس میں انسان کا اپنے خالق سے تعلق، اپنے نفس و جسم کی حفاظت، علم و عہد کی ذمہ داری، مال و راز کی حفاظت اور پورے معاشرے کے حقوق کی ادائیگی سب شامل ہیں۔ اسی وسعت کی وجہ سے قرآن نے امانت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ امانت آسمانوں، زمین و پہاڑوں کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کیا اور انسان نے اسے اٹھا لیا۔ مفسرین نے اس امانت سے فرائض و ذمہ داریوں کا وہ بوجھ مراد لیا ہے جو اختیار و شعور کے ساتھ انسان کو ملا ہے۔ اس جواب میں امانت کا مفہوم و فلسفیانہ بنیاد، اس کی اقسام، قرآن و سنت میں اس کی تعلیمات، خیانت کے نقصانات اور معاصر معاشرے میں امانت کی اہمیت بیان کی جائے گی۔

امانت کا مفہوم اور فلسفیانہ بنیاد

امانت کے لغوی معنی امن و اعتماد سے جڑے ہیں: جس شخص کے پاس کوئی چیز اس بھروسے سے رکھی جائے کہ وہ اس کی حفاظت کرے گا اور مالک کے مطالبے پر واپس کرے گا، وہ امین اور وہ چیز امانت کہلاتی ہے۔ اصطلاحی و فلسفیانہ سطح پر اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات میں انسان کسی چیز کا مطلق مالک نہیں بلکہ امین ہے۔ زندگی، جسم، مال، اولاد، علم، وقت، عہدہ اور اختیار، یہ سب اللہ کی عطا کردہ امانتیں ہیں جن کے بارے میں سوال ہو گا۔ قرآن میں انسان کو زمین میں خلیفہ قرار دینے کے تصور کے ساتھ یہی فلسفہ جڑا ہے: خلیفہ مالک نہیں ہوتا، وہ مالکِ حقیقی کے احکام کے مطابق تصرف کا پابند ہوتا ہے اور اپنے تصرف کا جواب دہ ہوتا ہے۔ اس فلسفے کے دو بڑے نتائج نکلتے ہیں۔ پہلا یہ کہ امانت میں خیانت صرف کسی انسان سے دھوکا نہیں بلکہ اللہ سے عہد کی خلاف ورزی بھی ہے، اس لیے یہ محض قانونی جرم نہیں بلکہ گناہ بھی ہے۔ دوسرا یہ کہ امانت کا دائرہ رضاکارانہ معاہدوں تک محدود نہیں رہتا؛ جو ذمہ داری انسان پر عہدے، رشتے یا انسانیت کی بنیاد پر عائد ہوتی ہے وہ بھی امانت ہے، چاہے کسی نے اسے لکھ کر سپرد نہ کیا ہو۔ یہی تصور اسلام کو محض قانون کے نظام سے بلند کر کے ضمیر کے نظام سے جوڑتا ہے، جہاں نگران نہ ہو تب بھی خیانت سے بچا جاتا ہے کیونکہ اصل نگران اللہ ہے۔

امانت کی اقسام

1۔ اللہ کی امانتیں: فرائض واحکام

امانت کی پہلی اور بڑی قسم وہ فرائض واحکام ہیں جو اللہ نے بندے کے سپرد کیے ہیں: ایمان، نماز، روزہ، زکاۃ، حج، سچائی وعدل جیسی اخلاقی ذمہ داریاں اور محرمات سے اجتناب۔ ان کی ادائیگی میں کوتاہی کو اہلِ علم نے امانت میں کوتاہی سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ یہ اس عہد کی خلاف ورزی ہے جو بندگی کے قبول کرنے سے خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔ اسی ضمن میں انسان کے اعضاء بھی امانت ہیں: آنکھ وکان وزبان کی حفاظت، جسم کو حلال رزق سے صحت کی رعایت اور وقت جیسی نعمت کا درست استعمال سب اسی قسم میں آتا ہے۔ وقت کی امانت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، کیونکہ عمر وہ سرمایہ ہے جو واپس نہیں آتا اور اس کے ہر حصے کا حساب ہوگا۔ اس قسم سے یہ اصول نکلتا ہے کہ امانت داری کا آغاز انسان کے اپنے رب اور اپنے نفس سے ہوتا ہے؛ جو شخص اس پہلی امانت میں ناکام ہو وہ دوسروں کی امانتوں میں بھی عموماً کمزور ثابت ہوتا ہے۔

2۔ بندوں کی امانتیں: مال، راز، عہدہ اور مشورہ

دوسری قسم بندوں کی امانتیں ہیں جن کی کئی صورتیں ہیں۔ مال واشیاء کی امانت سب سے مشہور صورت ہے جس میں رکھوائی گئی چیز کی حفاظت اور بروقت واپسی شامل ہے۔ راز کی امانت اس دور میں خاص اہم ہے: نبی کریم ﷺ کی تعلیم کے مطابق مجلس کی باتیں امانت ہوتی ہیں اور کسی کی نجی گفتگو اس کی اجازت کے بغیر آگے بیان کرنا خیانت ہے۔ عہدے ومنصب کی امانت یہ ہے کہ اختیار کو ذاتی مفاد، اقربا پروری اور رشوت سے بچا کر صرف اہل ومستحق کے لیے استعمال کیا جائے؛ قرآن نے اسی لیے عہدے اہل لوگوں کے سپرد کرنے اور لوگوں کے درمیان عدل سے فیصلہ کرنے کا حکم امانتوں کی ادائیگی کے ساتھ ایک ہی آیت میں بیان کیا ہے۔ مشورے کی امانت یہ ہے کہ جس سے مشورہ مانگا جائے وہ دیانت سے وہی رائے دے جو درست سمجھتا ہے، کیونکہ مستشار امین ہوتا ہے۔ اسی طرح ملازمت میں اوقات وفرائض کی پابندی، تدریس میں طلبہ کے وقت ومستقبل کی رعایت اور کاروبار میں گاہک کے ساتھ نوعیت ومعیار کی درست اطلاع بھی امانت کی صورتیں ہیں۔ ان تمام صورتوں کا مشترک اصول ایک ہی ہے: جہاں اعتماد موجود ہو وہاں اعتماد توڑنا خیانت ہے۔

جدول1: امانت کی اقسام اور ان میں خیانت کی صورتیں

امانت کی قسم	ادائیگی کی صورت	خیانت کی صورت
فرائض واحکام	عبادات واخلاقی پابندی	فرائض میں سستی، ریاکاری
مال واشیاء	حفاظت وبروقت واپسی	استعمال، ٹال مٹول، انکار
راز وگفتگو	نجی بات کو محفوظ رکھنا	افشائے راز، عیب جوئی
عہدہ واختیار	اہلیت وعدل سے فیصلے	رشوت، اقرباپروری، بدعنوانی
علم ومشورہ	درست ودیانت دارانہ رہنمائی	غلط بیانی، مفاد پرستی

قرآن وسنت میں امانت کی تعلیمات

قرآن مجید نے امانت کو ایمان کے ساتھ جوڑا ہے۔ سورۃ المؤمنون میں کامیاب مومنوں کی صفات گنواتے ہوئے کہا گیا کہ وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہوتے ہیں، اور سورۃ المعارج میں بھی یہی وصف دہرایا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امانت داری اتفاقی خوبی نہیں بلکہ ایمان کی لازمی نشانی ہے۔ سورۃ النساء میں صریح حکم ہے کہ امانتیں ان کے اہل لوگوں تک پہنچائی جائیں، اور سورۃ الانفال میں اللہ ورسول اور اپنی امانتوں میں خیانت سے منع کیا گیا ہے۔ سنت میں اس کی تاکید اس قدر ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس میں امانت داری نہیں اس کا ایمان نہیں اور جس میں عہد کی پابندی نہیں اس کا دین نہیں، اور ایک مشہور حدیث میں منافق کی تین علامتوں میں وعدہ خلافی کے ساتھ امانت میں خیانت بھی گنوائی گئی ہے۔ آپ ﷺ کی اپنی سیرت امانت کا عملی معیار ہے: نبوت سے قبل لقب ہی ”امین“ تھا، تجارت میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال دیانت سے لے کر جانا مشہور ہے، اور قریش کے دشمنوں کی امانتیں ہجرت کی رات لوٹانے کا اہتمام آپ ﷺ کی امانت داری کی وہ مثال ہے جہاں ذاتی دشمنی بھی اعتماد کو نہ توڑ سکی۔ اسی تعلیمی مجموعے سے فلسفۂ امانت کی روح واضح ہوتی ہے: امانت داری ایمان کا ثمر ہے، سیرت اس کا نمونہ ہے اور آخرت کی جواب دہی اس کی ضمانت ہے۔

خیانت کے نقصانات اور امانت کے معاشرتی فوائد

خیانت کے نقصانات انفرادی و اجتماعی دونوں سطح پر گہرے ہوتے ہیں۔ انفرادی سطح پر خائن شخص کا ضمیر مردہ ہوتا جاتا ہے، اس کی ساکھ ختم ہو جاتی ہے اور وقتی فائدے کے بدلے وہ مستقل بدنامی خرید لیتا ہے۔ اجتماعی سطح پر خیانت بار بار نظامِ اعتماد کو کھوکھلا کر دیتی ہے: جب ملازم فرض میں خیانت کرے، تاجر معیار میں خیانت کرے، استاد تدریس میں خیانت کرے اور حکمران اختیار میں خیانت کرے تو ادارے کاغذ پر باقی رہتے ہیں مگر ان کی کارکردگی ختم ہو جاتی ہے۔ ترقی یافتہ و پسماندہ معاشروں کے فرق کی ایک بڑی وجہ یہی دیانت کا اجتماعی مزاج ہے؛ جہاں امانت عام ہو وہاں قانون نافذ کرنے کی لاگت کم، تجارت کا اعتماد زیادہ اور ترقی کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ اس کے برعکس امانت داری کے فوائد معاشرے میں اعتماد، سکون اور برکت کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں: لوگ بے خوف لین دین کرتے ہیں، معاہدے قابلِ عمل بنتے ہیں اور کمزور کا حق طاقتور کے پاس بھی محفوظ رہتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں بازاروں کی دیانت اور قاضیوں کے عدل کی شہرت اسی مزاج کا نتیجہ تھی۔ آج کے دور میں کرپشن، جعل سازی اور ڈیٹا وراز کی خیانت جیسے مسائل اسی قدیم اصول کی خلاف ورزی کی نئی صورتیں ہیں، جن کا پائیدار حل سزاؤں کے ساتھ ساتھ امانت کے دینی و اخلاقی شعور کو بیدار کرنا بھی ہے۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ امانت کا اسلامی فلسفہ اس بنیاد پر قائم ہے کہ انسان مالک نہیں امین ہے؛ زندگی سے لے کر عہدے تک ہر نعمت و ذمہ داری اللہ اور بندوں کی امانت ہے جس کا حساب ہو گا۔ قرآن نے امانت داری کو ایمان کی نشانی اور کامیاب مومنوں کی صفت قرار دیا، سنت نے خیانت کو نفاق کی علامت بتایا اور سیرتِ نبوی نے اس کا کامل نمونہ پیش کیا۔ معاشرے کی ترقی، اداروں کی ساکھ اور افراد کا سکون سب اسی ایک اصول سے جڑے ہیں۔ طالب علم کے لیے عملی سبق یہ ہے کہ وہ امانت کو صرف رکھی ہوئی چیز سمجھنے کے بجائے اپنی پڑھائی، اپنے وقت، اپنے اساتذہ و والدین کے اعتماد اور مستقبل کے عہدے تک پھیلا ہوا فرض سمجھے، کیونکہ دیانت وہ عادت ہے جو چھوٹی امانتوں سے بنتی ہے اور بڑی ذمہ داریوں میں پرکھی جاتی ہے۔

سوال نمبر 5 (20 نمبر)

سوال: سود کی حرمت اور نقصانات بیان کریں۔(20)

تعارف

سود (ربا) اسلامی معاشی اخلاق کے ان مسائل میں سے ہے جن پر قرآن و سنت نے سب سے سخت اور واضح موقف اختیار کیا ہے۔ سود کو ہر آسمانی شریعت میں ناپسند کیا گیا، مگر اسلام نے اسے قطعی حرام قرار دے کر اس کے تمام دروازے بند کیے اور اس کے مقابلے میں صدقہ، قرض حسنہ، تجارت اور شراکت داری جیسے متبادل نظام پیش کیے۔ سود کی حرمت کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ مسئلہ صرف شرح فیصد کا نہیں ہے؛ اصل بات یہ ہے کہ دولت کی ایسی بڑھوتری ہے جو بغیر حقیقی خطرے، محنت و کاروباری شرکت کے محض قرض اور مدت کی بنیاد پر پہلے سے طے کر لی جاتی ہے، جس کا بوجھ بالآخر ضرورت مند مقروض پر پڑتا ہے اور دولت چند ہاتھوں میں سمٹتی جاتی ہے۔ قرآن مجید نے سود کو اللہ و رسول سے جنگ کے مترادف قرار دیا، نبی کریم ﷺ نے سود کھانے، کھلانے، لکھنے اور اس کی گواہی دینے والوں سب پر لعنت کی حدیث بیان فرمائی اور سود کو ہلاک کرنے والے بڑے گناہوں میں شمار کیا۔ اس جواب میں سود کی تعریف و اقسام، حرمت کے دلائل و حکمت، اس کے معاشی و اخلاقی و سماجی نقصانات اور اسلام کے پیش کردہ متبادل نظام کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔ یہ بحث خالصتاً تعلیمی و علمی ہے؛ کسی مخصوص مالی معاملے کے شرعی حکم کے لیے اہلِ علم سے رجوع کرنا چاہیے۔

سود کی تعریف اور اقسام

سود کے لیے عربی میں لفظ "ربا" استعمال ہوتا ہے جس کے لغوی معنی ہیں بڑھنا، زیادہ ہونا اور چڑھنا۔ شرعی اصطلاح میں ربا سے مراد قرض یا مخصوص اشیاء کے تبادلے میں وہ مشروط اضافہ ہے جو اصل کے مقابلے میں بغیر کسی حقیقی عوض کے لیا جائے۔ فقہاء نے ربا کی دو بڑی قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلی ربا النسیئۃ ہے یعنی قرض میں مدت کے بدلے اضافہ: جتنی رقم دی گئی ہو اس سے زیادہ واپس لینا، یا مدت بڑھانے پر اضافہ لگانا۔ جاہلیت کے عرب میں یہی صورت عام تھی کہ مقروض ادائیگی نہ کر سکے تو مدت بڑھا کر اصل بڑھا دیا جاتا تھا، یہاں تک کہ قرض کئی گنا ہو جاتا تھا؛ قرآن نے اسی دوگنا چوگنا سود کو خاص طور پر منع کیا۔ دوسری قسم ربا الفضل ہے یعنی ان اشیاء کے ہاتھوں ہاتھ تبادلے میں

مقدار کی کمی بیشی جن میں علتِ ربا پائی جاتی ہے، جیسا کہ مشہور حدیث میں سونا، چاندی، گندم، جو، کھجور اور نمک کا ذکر آیا ہے کہ ان کا تبادلہ برابری و نقد کی شرائط کے ساتھ ہو۔ فقہاء نے ان دو قسموں کی باریکیاں اصولِ فقہ میں مفصل بیان کی ہیں؛ طالب علم کے لیے بنیادی نکتہ یہ سمجھنا کافی ہے کہ اسلام نے سود کی مشہور صورت بھی بند کی اور ان ذرائع کو بھی روکا جن سے سود چور دروازے سے داخل ہو سکتا تھا۔ اسی کو شریعت کی اصطلاح میں سدِ ذرائع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سود کی حرمت کے دلائل اور تدریجی اعلان

سود کی حرمت قرآن مجید میں تدریج کے ساتھ اعلانی گئی۔ ابتدائی مرحلے میں سود اور صدقے کا تقابل پیش کیا گیا کہ سود بظاہر بڑھتا ہے مگر اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، جبکہ زکاۃ و صدقے کی نیت سے دیا گیا مال حقیقت میں بڑھتا ہے۔ پھر اہلِ کتاب کے سود لینے کی مذمت آئی، پھر بڑھتے چڑھتے سود سے صریح ممانعت ہوئی اور آخر میں سورۃ البقرہ کی آیات میں قطعی حکم نازل ہوا کہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے، اور سود سے توبہ کرنے والوں کو صرف اصل مال واپس لینے کی اجازت دی گئی، نہ ظلم کرو نہ تم پر ظلم ہو۔ ان آیات میں سود ترک نہ کرنے پر اللہ و رسول کی طرف سے جنگ کے اعلان کی سخت وعید آئی ہے، جو کسی اور معاشی گناہ کے بارے میں اس درجے میں نہیں آئی۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں جاہلیت کے تمام سودوں کو کالعدم قرار دینے کا اعلان فرمایا اور ابتدا اپنے خاندان کے سود سے کی، جس سے حکم کی عمومیت و سنجیدگی ظاہر ہوتی ہے۔ فقہاء کے نزدیک اس مسئلے میں امت کا اجماع ہے کہ سود حرام ہے، البتہ جدید مالیاتی صورتوں کے اطلاق میں علمی بحثیں جاری ہیں جن کا فیصلہ مستند اہلِ علم و دارالافتاء کا کام ہے۔ اس تدریجی اعلان سے شریعت کا مزاج بھی سمجھ آتا ہے کہ معاشرے میں رچی ہوئی برائی کو پہلے ذہن سازی، پھر تنبیہ اور آخر میں قطعی قانون سے ختم کیا جاتا ہے۔

حرمت کی حکمتیں

سود کی حرمت کی کئی حکمتیں علماء و مفکرین نے بیان کی ہیں۔ پہلی حکمت یہ ہے کہ سود میں فائدہ بغیر خطرے کے یقینی ہوتا ہے جبکہ مقروض کا نقصان یقینی ہو سکتا ہے؛ یہ عدم توازن انصاف کے خلاف ہے، کیونکہ کاروبار کے فائدے کے ساتھ خطرے کی شرکت فطری عدل ہے۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ سود مال کو محنت و پیداوار سے الگ کر دیتا ہے؛

جب سرمایہ محنت کیے بغیر یقینی منافع دے تو لوگ تجارت، زراعت و صنعت جیسے حقیقی کاموں کے بجائے قرض دینے کو ترجیح دیتے ہیں اور پیداواری سرگرمی کمزور ہو جاتی ہے۔

تیسری حکمت یہ ہے کہ سود دولت کی گردش کو روک کر اسے دولت مندوں کے دائرے میں قید کر دیتا ہے، جبکہ اسلام مال کی گردش چاہتا ہے تاکہ وہ صرف امیروں ہی میں نہ گھومتا رہے۔ چوتھی حکمت اخلاقی ہے: سود ضرورت مند کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، جبکہ اسلام مجبور کی مدد کو صدقہ و قرضِ حسنہ کی صورت میں عبادت بناتا ہے۔

پانچویں حکمت یہ ہے کہ سود ذہنیت میں خود غرضی، بے رحمی اور مال پرستی پیدا کرتا ہے، جبکہ ایثار، ہمدردی اور باہمی تعاون معاشرے کی روح ہیں۔ ان حکمتوں کا مجموعہ بتاتا ہے کہ حرمتِ سود کسی خشک قانونی پابندی کا نام نہیں بلکہ پورے معاشی و اخلاقی نظام کی ضمانت ہے۔

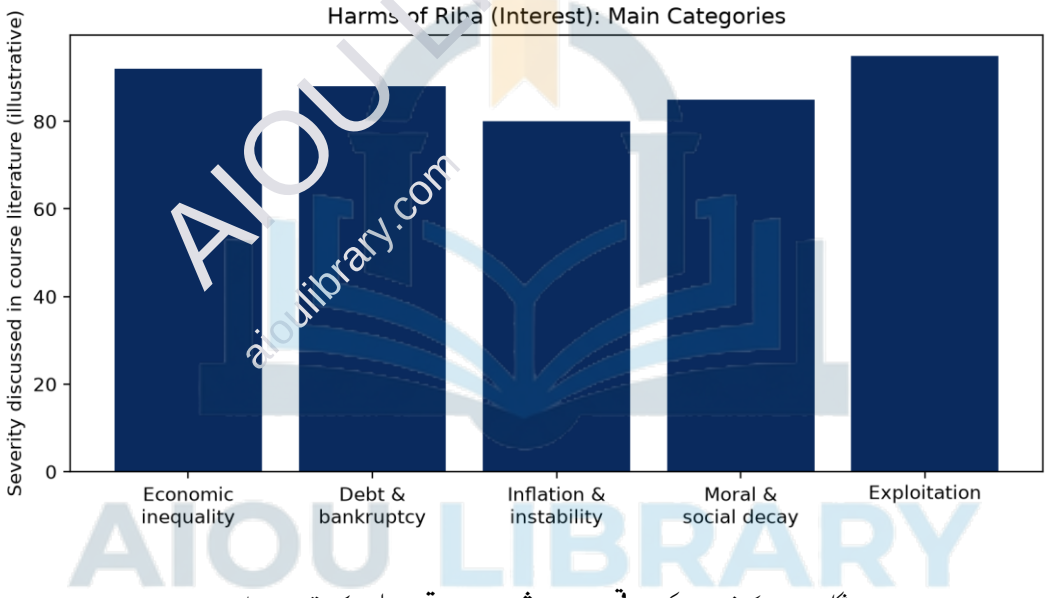

شکل 1: سود کے نقصانات کی بڑی قسمیں — معاشی، سماجی و اخلاقی (تدریسی خاکہ، قدریں مثالی ہیں)

سود کے معاشی و سماجی نقصانات

1۔ معاشی نقصانات

معاشی سطح پر سود کا پہلا نقصان دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے: سود خور کا سرمایہ مقروض کی کمائی سے یقینی طور پر بڑھتا رہتا ہے اور امیر و غریب کا فاصلہ ہر دورے کے ساتھ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ دوسرا نقصان مقروضیت کا جال ہے؛ افراد سے لے کر ریاستوں تک، قرض پر قرض لینے کی زنجیر بن جاتی ہے جس میں اصل سے زیادہ سود ادا ہوتا رہتا ہے

اور پیداوار کا بڑا حصہ پیداواری کام کے بجائے سود کی ادائیگی میں کھپ جاتا ہے۔ تیسرا نقصان مہنگائی و عدم استحکام ہے: جب پیداواری لاگت میں سود شامل ہوتا ہے تو قیمتوں میں بے وجہ اضافہ ہوتا ہے، اور سودی نظام میں بحران کے دورے یعنی توسیع و کساد بازاری کے اتار چڑھاؤ شدید ہو جاتے ہیں، جس کا بوجھ عام آدمی پر پڑتا ہے۔ چوتھا نقصان یہ ہے کہ کاروباری خطرہ ایک طرف رہ جاتا ہے: قرض دینے والا نفع میں شریک ہوئے بغیر اپنا اضافہ یقینی بنالیتا ہے اور ناکامی کا سارا بوجھ کاروباری یا مقروض اٹھاتا ہے، جس سے کاروبار کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ پانچواں نقصان بے روزگاری سے جڑا ہے: جب سرمایہ سودی کھاتوں میں محفوظ منافع پاتا ہے تو صنعتی و زرعی سرمایہ کاری گھٹتی ہے اور روزگار کے مواقع کم ہوتے ہیں۔ جدید معاشیات کے کئی ماہرین نے بھی سودی قرضوں کے بڑھتے بوجھ اور آمدن کی عدم مساوات پر تنقید کی ہے، اگرچہ ان کی بنیاد الگ ہے؛ طالب علم کو دونوں بحثوں میں فرق رکھنا چاہیے اور دینی حکم کو بنیادی طور پر شریعت کی اطاعت کے طور پر سمجھنا چاہیے۔

2۔ اخلاقی و سماجی نقصانات

اخلاقی و سماجی سطح پر سود کے نقصانات اس سے بھی گہرے ہیں۔ سود انسان میں لالچ و حرص کو پروان چڑھاتا ہے، کیونکہ اس کے ہاں مال کا بڑھنا ہی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ یہ مزاج بے رحمی پیدا کرتا ہے: مقروض کی تباہی، گھر کی نیلامی یا کسان کی خودکشی بھی سود خور کے حساب کو نہیں روکتی، کیونکہ نظام میں انسانی ہمدردی کی کوئی جگہ نہیں رکھتی۔ سماجی سطح پر سود طبقاتی کشمکش کو جنم دیتا ہے؛ مقروض طبقہ سرمایہ دار سے نفرت کرنے لگتا ہے اور یہی نفرت عدم اعتماد، انتشار اور بعض اوقات جرائم کی شکل اختیار کرتی ہے۔ خاندانی سطح پر قرض کا بوجھ ذہنی دباؤ، گھریلو جھگڑوں اور ذہنی بیماریوں کا سبب بنتا ہے، جس کے اخباری و سماجی شواہد ہمارے معاشرے میں عام ہیں۔ اس کے علاوہ سود صدقہ و خیرات کے جذبے کو کھا جاتا ہے: جس معاشرے میں ضرورت مند کو مدد کے بجائے سود پر قرض ملے، وہاں انسانی تعلق بازار کے سودے میں بدل جاتا ہے۔ اسلام کی نظر میں یہی سب سے بڑا نقصان ہے کہ اقتصادی عمل انسان کو انسان سے جوڑنے کے بجائے اسے اس کے استحصال کا ذریعہ بنا دے۔ اسی لیے قرآن نے سود کے مقابلے میں صدقے کو رکھا ہے: سود کماتا ہے مگر محبت گھٹاتا ہے، صدقہ بظاہر گھٹاتا ہے مگر معاشرہ بڑھاتا ہے۔

جدول 2: سود اور اسلامی متبادل کا موازنہ

پہلو	سودی نظام	اسلامی متبادل
فائدے کی بنیاد	قرض و مدت پر طے شدہ اضافہ، خطرہ نہیں	تجارت / شراکت میں حقیقی خطرے کے ساتھ نفع
مقروض کمزور پر اثر	بوجھ بڑھتا ہے، مہلت بھی قیمت پر ملتی ہے	مہلت و رعایت کی تلقین، قرضِ حسنہ و صدقہ
دولت کی گردش	چند ہاتھوں میں ارتکاز	زکاۃ، صدقہ، میراث سے تقسیم و گردش
ناکامی کا بوجھ	سارا بوجھ مقروض پر	مضاربہ / مشارکہ میں اصول کے مطابق شرکت

اسلام کا پیش کردہ متبادل نظام

اسلام نے سود کو حرام قرار دے کر معیشت کو خالی نہیں چھوڑا بلکہ اس کے پورے متبادل پیش کیے۔ تجارت کو حلال قرار دے کر لین دین اور خرید و فروخت کی راہ کھولی گئی۔ مضاربہ و مشارکہ جیسی شراکت داریاں سرمایے اور محنت کو نفع و نقصان میں شریک بناتی ہیں، جس سے عدل بھی قائم رہتا ہے اور سرمایہ حقیقی معیشت سے جڑا بھی رہتا ہے۔ زکاۃ و صدقات کا نظام دولت کی سالانہ گردش کو یقینی بناتا ہے اور ضرورت مند کا حق امیر کے مال میں مقرر کر دیتا ہے۔ قرضِ حسنہ کو عظیم اجر کا عمل قرار دیا گیا اور مقروض کو مہلت دینے بلکہ معاف کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ وقف کا ادارہ تعلیم، صحت و فلاح کے دائمی انتظام کی تاریخی مثال ہے۔ جدید دور میں اسلامی بینکاری و مالیات انہی اصولوں کو ادارہ جاتی صورت دینے کی کوشش ہے، جس کی تفصیلات و شرعی جائزے کا کام اہلِ تخصص کا ہے۔ طالب علم کے لیے اصل نکتہ یہ ہے کہ اسلامی معیشت سود کو فرد کی حرمت سے بڑھ کر نظام کی سطح پر دیکھتی ہے: جس نظام میں کمزور کا تحفظ، دولت کی گردش اور خطرے کی منصفانہ تقسیم نہ ہو وہ اس کے نزدیک درست نہیں، چاہے اس کی شرح سود ہی کیوں نہ کم ہو۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ سود ہر وہ طے شدہ اضافہ ہے جو قرض وتبادلے میں بغیر حقیقی عوض وخطرے کے لیا جائے؛ قرآن نے تدریج سے اسے قطعی حرام قرار دیا، سنت نے اس کے تمام معاون کرداروں کی مذمت کی اور اجماعِ امت اس پر قائم ہے۔ اس کی حکمتیں عدل، دولت کی گردش، پیداوار کی ترغیب اور کمزور کا تحفظ ہیں، اور اس کے نقصانات عدم مساوات، مقروضیت کا جال، مہنگائی، بے رحمی اور سماجی نفرت کی صورت میں آج بھی سامنے ہیں۔ اسلام کا دیا ہوا متبادل تجارت، شراکت، زکاۃ، قرضِ حسنہ اور وقف کا وہ نظام ہے جو معیشت کو اخلاق سے جوڑتا ہے۔ طالب علم کو چاہیے کہ وہ اس موضوع کو جذباتی نعروں کے بجائے انہی دلائل وحکمتوں کے ساتھ سمجھے اور اپنی عملی زندگی میں قرض ولین دین کے معاملات میں اہلِ علم کی رہنمائی کو لازم پکڑے۔

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com